جناب جسٹس ایس - اے - رحمٰن

قائدِ اعظمؒ

(چند یادیں)

جون ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کا منصوبہ سرکاری سطح پر زیرِ عمل تھا۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے اکابر کی، اپنی اپنی جماعت کے مفاد کی نگہداشت کے لیے شب و روز کی مساعی اوج پر تھیں۔ اسی سلسلہ میں راقم کو مسلم لیگ کی جانب سے بکارِ خاص نئی دہلی میں طلب کیا گیا۔ بادی النظر میں تو راقم محض تقسیم کمیٹی کی ایک ذیلی کمیٹی یعنی توطن کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا، لیکن دہلی میں اپنے میزبان چوہدری محمد علی سے (جو تقسیم سے متعلق راہبر کمیٹی میں لیگ کے نمائندہ تھے) معلوم ہوا کہ لیگ کی جانب سے راقم کی طلبی کی اصل غرض و غایت بعض آئینی مسائل پر اس خاکسار سے مشاورت تھی - ان دنوں ایک آئینی بل کا مسودہ برطانوی پارلیمنٹ میں آنے والا تھا جس کا مقصد حکومتِ ہند کے آئین میں چند عبوری تبدیلیاں کرنا مقصود تھا۔ اس مسودے سے متعلق لیگ اور کانگریس دونوں سے استصوابِ رائے بصیغۂ راز عمل میں آیا۔ چنانچہ وائسریگل لاج میں ایک کمرہ چوہدری محمد علی اور راقم کی تحویل میں دے دیا گیا۔ آئینی ترمیمات کا مسودہ راقم کے سپرد ہوا۔ اس کا مطالعہ کر کے خاکسار کو اس پر تحریری تبصرہ کرنا تھا لیکن مسودہ وائسریگل لاج سے باہر لے جانے کی اجازت نہ تھی۔

بعد از غور و خوض میں نے اپنا تبصرہ ٹائپ کروایا اور اسے قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے قریباً ۱۱½ بجے دن ۱۰ - اورنگ زیب روڈ پہنچا۔ اطلاع کرانے پر فوراً میری طلبی ہوئی۔ قائدِ اعظمؒ نے مسودہ پڑھ کر ایک دو جگہ لفظی تبدیلی کی۔ ارشاد ہوا کہ مسودہ کو دوبارہ ٹائپ کروا کے انھیں ایک مرتبہ پھر دکھایا جائے۔ ساتھ ہی بکمال شفقت فرمایا کہ خاکسار کے لیے وقت کی کوئی پابندی نہ ہو گی۔ جب بھی مجھے ضرورت محسوس ہو، میں آ کر اطلاع کراؤں تو وہ مجھے فوراً طلب فرمالیں گے۔

میں واپس آیا۔ وائسریگل لاج میں اسٹینو سے دوبارہ مسودہ ٹائپ کروایا۔ اس بھلے آدمی نے اس

کام کی تکمیل میں ضرورت سے زیادہ ہی وقت صرف کیا۔ جب وہ یہ مسودہ لے کر قائدِ اعظمؒ کی رہائش گاہ پر پہنچا تو دن کے دو بج چکے تھے۔ اُن کے ذاتی سکریٹری مسٹر خورشید سے معلوم ہوا کہ قائدِ اعظمؒ چند لمحہ پہلے دوپہر کا کھانا نوش فرما کر اپنی خواب گاہ میں بغرضِ استراحت جا چکے ہیں اور اب ان کے آرام میں مُخل ہونا ممکن نہ ہوگا۔ میں نے اپنی نسبت اذنِ عام کے حکم سے مسٹر خورشید کو مطلع کیا اور اُن سے کہا کہ وہ میری آمد کی اطلاع کروا دیں اور فیصلہ خود قائدِ اعظمؒ کی صوابدید پر چھوڑ دیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور میں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ قائد اعظمؒ کے قدموں کی چاپ، بالائی منزل کی سیڑھیوں پر سنائی دی اور دوسرے لمحے وہ مسکراتے ہوئے ڈرائنگ روم میں تھے۔

اب کے پھر مسودہ کی عبارت دہرائی گئی اور ایک آدھ لفظی ترمیم کا مشورہ ملا۔ حکم ہوا کہ مسودہ مکرر ٹائپ ہو اور صاف شدہ مسودہ آخری صورت میں ان کے ملاحظہ سے گزرے۔ میں واپس گیا اور ارشاد کی تعمیل میں ۳ بجے سہ پہر کے وقت پھر حاضرِ خدمت ہوا۔ اب کے مسودہ کی منظوری مکمل ہوئی اور آپ نے ارشاد فرمایا: "میرا خیال ہے یہ مراسلہ اب کافی زوردار ہے۔ کیسے آپ کی کیا رائے ہے؟" میں نے [illegible] فرمایا کہ "اب یہ مراسلہ آپ خود جا کر وائسرائے کے ذاتی سکریٹری کو پہنچا آئیں تاکہ [illegible]" مجھے اس بارے میں کیا عذر ہوسکتا تھا۔ چنانچہ میں لفافہ سر بمہر کرکے مسٹر جارج ایبل کے سپرد کر آیا۔

اس واقعہ میں قارئین قائدِ اعظمؒ کے [illegible] کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ باوجود پیرانہ سالی کے آپ نے ذاتی آرام پر منصبی ذمہ داری کو فوقیت دی۔ سخت کوشی کے ساتھ ساتھ ان کی حزم و احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کام کے ہر مرحلہ پر جزئیاتِ کار میں ذاتی طمانیت کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کی اسی خصوصیت کے طفیل ان کا لکھا اور ان کا کہا، دونوں ہی سیاسی دنیا میں قطعی اور اٹل ہوتے تھے۔ وہ اپنے مخلصوں سے مشورہ طلب کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے لیکن بغیر غائر مطالعے کے سرسری رائے کے اظہار کو ناپسند فرماتے تھے۔ خود محنتِ شاقہ کے خوگر تھے اور اسی نوع کی محنت کی دوسروں سے توقع رکھتے تھے۔

انہی ایام میں، ان سے قرب کا ایک اور موقع میسّر آیا۔ ایک روز چوہدری محمد علی اور یہ

خاکسار اپنے کمرہ میں مصروفِ کار تھے کہ گورنمنٹ ہند کے سکریٹری قانون سر جارج سپنس کمرے میں داخل ہوئے۔ چند لمحے بعد خود قائدِ اعظمؒ اور قائدِ ملت لیاقت علی خان ہمارے کمرے میں تشریف لائے۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے سر جارج سپنس کو اس غرض سے طلب کیا ہے کہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں ان مجوزہ ترمیمات کی تشریح کریں جو بھارت اور پاکستان کے آئینی ڈھانچے کی بنیاد بننے والی تھیں۔

سب حضرات بیٹھ گئے اور سر جارج نے تفصیل کے ساتھ مجوزہ ترمیمات پر روشنی ڈالی۔ یہ کام اختتام کو پہنچا ہی تھا کہ غیر متوقع طور پر خود وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن تشریف لے آئے اور آتے ہی اپنی روایتی شگفتگی کے انداز میں فرمایا: "میں امید کرتا ہوں کہ یہاں ہر صاحب کو آسودگی ملی ہوگی۔ مجھے افسوس ہے کہ اس سے بہتر مکانیت آپ صاحبان کے لیے مہیا نہ ہو سکی"۔ پھر وہ قائدِ اعظمؒ کے قریب بیٹھ گئے اور ان سے ایک دلچسپ گفتگو کا آغاز کیا۔ (میں حتی الوسع کوشش کروں گا کہ جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے ان دونوں کا باہمی بات ان کے اپنے الفاظ میں پیش کروں۔ م سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ق سے قائدِ اعظم مراد ہیں)۔

م۔ "مسٹر جناح! مجھے اس بات سے مایوسی ہوئی ہے کہ آپ مجھے بطور گورنر جنرل قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ میں تو گھر (یعنی برطانوی سرکار کو) لکھ چکا تھا کہ میں دونوں نئی ریاستوں کا مشترکہ گورنر جنرل نامزد ہونے کی امید رکھتا ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ اس پر راضی نہیں"۔

ق۔ "لارڈ ماؤنٹ بیٹن! جب بھارت نے آپ کو اپنا گورنر جنرل نامزد کر دیا تو ہمارے لیے مشکل ہو گیا کہ ہم بھی آپ کو گورنر جنرل کا عہدہ پیش کریں۔ اب بھی ہم یہ پسند کریں گے کہ آپ دونوں ملکوں کے گورنر جنرلوں سے بالا سپر گورنر جنرل ہوں جو برطانوی سرکار کی نمائندگی کر کے دونوں ملکوں کے درمیان منصفانہ تقسیم کا اہتمام کرے"۔

م۔ "لیکن سوءِ قسمت سے برطانوی سرکار اس قسم کی تجویز سننے کی بھی روادار نہیں"۔

ق۔ "لارڈ ماؤنٹ بیٹن! کیا آپ جانتے ہیں کہ کیوں آپ کو بھارتیوں نے گورنر جنرل کا عہدہ پیش کیا؟ یہ اس لیے کہ وہ آپس میں اتفاق نہیں کر سکے کہ ان میں سے کون اس عہدہ پر فائز ہو"۔

گفتگو کا باقی حصہ میرے حافظہ میں محفوظ نہیں رہا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ شگفتہ روئی کے مظاہرہ کے علی الرغم لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس بات پر سخت خفا ہیں کہ لیگ کے اکابر نے انھیں دونوں ملکوں کے مشترکہ گورنر جنرل کی منزلت بخشنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس واقعہ کے ایک دو دن بعد چوہدری محمد علی مجھے ایک شام خان لیاقت علی خان کے ہاں لے گئے۔ باتوں باتوں میں قائدِ ملت نے چوہدری صاحب سے استفسار کیا "کیا آپ نے انھیں بتا دیا ہے کہ نہیں؟" چوہدری صاحب نے جواب دیا "نہیں"۔ تب یہ راز کھلا کہ مجھے بنگال سرحدی کمیشن میں لیگ کے نمائندہ رکن کی حیثیت سے کلکتہ جانا ہوگا اور کہ لیگ کی جانب سے دوسرے نمائندہ رکن کلکتہ ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس محمد اکرم ہوں گے میں اپنے ساتھ مختصر سا سامان لے کر گیا تھا کیوں کہ میرے اندازے کے مطابق دہلی کے قیام میں طوالت کا امکان نہ تھا۔ نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر لاہور فون کیا گیا اور یوں مزید سامان کی فراہمی کے بعد میں کلکتہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

روانہ ہونے سے قبل پھر قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ نئی ذمہ داری سنبھالنے سے پہلے ان کی دعاؤں کا توشہ ساتھ لے لوں۔ اس ملاقات میں قائدِ اعظمؒ نے سرحدی کمیشن کے دائرۂ عمل پر اظہارِ خیال کیا۔ کمیشن کے امورِ حوالہ میں اہم ترین امر یہ تھا کہ شمال مغربی اور جنوب مشرقی خطوں میں، کمیشن ہم جوار مسلم اکثریت کے علاقوں کی تعیین کر کے، دونوں نئے ملکوں کی حد بندی کرے گا۔ لیکن یہ امر "دیگر عوامل کے تابع" تھا۔ یہ شرط بعد میں کمیشن کے صدر سر سیرل ریڈ کلِف کے ہاتھوں میں تقریباً مطلق العنانی کا حربہ ثابت ہوئی۔ کمیشن میں دو نمائندے کانگریس کے اور دو لیگ کے تھے اور ظاہر ہے کہ ان دو جماعتوں کے نمائندے حد بندی کے معاملے میں متفق النظر نہ ہو سکتے تھے۔ ان میں اختلافِ رائے کی صورت میں خطِ حد کی کشید کا اختیار دستِ صدر میں تھا اور ان کے لیے لازم نہ تھا کہ وہ اپنے قطعی فیصلہ کی تائید میں کوئی دلائل بھی پیش کریں۔ لہٰذا اس ضمن میں وہ کسی یقین افروز عمل سے بے نیاز تھے۔ قائدِ اعظمؒ کا خیال تھا کہ شرائطِ حوالہ کے ماتحت ہم پاکستان کے لیے آسام کے ان مسلم اکثریت کے چند چھوٹے چھوٹے علاقوں کا مطالبہ کر سکتے ہیں جو بنگال کی شمالی سرحد سے ملحق ہیں۔ میں نے جھجکتے

ہوئے مشبہ کا اظہار کیا کہ غالباً سلہٹ اور کاچار کے علاوہ ہمیں آسام کے کسی اور علاقہ سے کچھ ملنے کی امید کم ہے۔ لیکن قائدِ اعظمؒ مُصر تھے کہ ہم یہ مطالبہ زور دار انداز میں کریں۔ مَیں نے انھیں یقین دلایا کہ ہم اس بارے میں امکانی کوشش کریں گے۔ میرا یہ خدشہ بعد میں صحیح ثابت ہوا اور صاحبِ صدر کا حرفِ آخر اس ضمن میں ہمارے خلاف نکلا۔ نہ صرف یہ بلکہ جناب صاحبِ صدر کا فیصلہ سلہٹ اور کاچار کی نسبت بھی ہمارے واضح حقوق کی پامالی پر منتج ہوا۔ قائدِ اعظمؒ نے برطانوی بار کی روایات کے پیشِ نظر جو توقعات سر سیرل ریڈ کلف سے وابستہ کی تھیں، موہوم ثابت ہوئیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے: کمیشن کے کام کے سلسلے میں میرا قیام ۵ جولائی ۱۹۴۷ سے ۸ اگست ۱۹۴۷ تک کلکتہ میں رہا۔ آخری تاریخ سے قبل صدر نے لیگ اور کانگریس کے نمائندہ ارکان کے ساتھ علیحدہ علیحدہ نشستوں میں خاص بنگال کے علاقوں کی حد بندی سے متعلق گفت و شنید مکمل کر لی تھی۔ سلہٹ اور کاچار کے خطوں کی نسبت گفتگو دہلی میں ہونی تھی۔ ۹ اگست کو ہم عازمِ دہلی ہوئے۔ ۱۱ اگست کو دہلی میں سر سیرل ریڈ کلف کے ساتھ ہماری آخری نشست ہوئی۔

جس دن ہم کلکتہ سے روانہ ہوئے، اسی دن میں نے ایک مراسلہ سر سیرل کو دہلی کے پتہ پر روانہ کیا تھا۔ اس مراسلہ کے ذریعے چند امور کی طرف ان کو توجہ دلائی گئی تھی۔ مشرقی اور مغربی بنگال کی درمیانی حد سے متعلق جن عبوری خیالات کا اظہار کلکتہ میں ان کی طرف سے ہوا تھا، ان سے میں مضطرب تھا۔ مَیں نے ان سے اپیل کی تھی کہ ان مزید حقائق کی روشنی میں جو مراسلہ میں درج تھے، وہ اپنا نقطۂ نظر بدلیں۔ جب ہم دہلی پہنچے تو ان کا جواب مجھے اپنی قیام گاہ پر ملا۔ مَیں نے اسی وقت ایک مزید وضاحتی خط انھیں لکھا اور دوسرے ہی دن ان کا جواب موصول ہوا جس میں انھوں نے مجھے مطلع کیا تھا کہ انھوں نے حتی الامکان علاقہ ندیا کے دریاؤں سے متعلق میرے زاویۂ نگاہ سے قریب تر ہونے کی کوشش کی ہے اور اب وہ اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ ماتابھنگا دریا کو مشترکہ حد تسلیم کر لیا جائے۔ یہ بات میرے لیے قدرے باعثِ امتنان تھی کیونکہ اس تبدیلی کے بغیر، حد بندی سے مشرقی بنگال کا کچھ اور علاقہ بھی ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتا۔ بہرحال انھوں نے بارہ سَت سب ڈویژن (جو مسلم اکثریت کا علاقہ تھا) کا الحاق شہر کلکتہ

سے مناسب سمجھا کیونکہ ہگلی دریا سے متعلقہ کلٹی آؤٹ فال منصوبہ اور کلکتہ کے مفادات کی حفاظت کے لیے اُن کی رائے میں یہ اقدام لازمی تھا۔

تاہم ان کا شاہ کار فیصلہ سلہٹ اور کاچار سے متعلق تھا۔ ۱۱ اگست کو بحث و تمحیص کے دوران میں صدر کی توجہ مَیں نے پہلے سے تیار کردہ ایک بڑے نقشے کی طرف منعطف کی جس میں مسلم اکثریت کے علاقے سب ڈویژن وار دکھائے گئے تھے۔ اس نقشہ سے واضح ہو رہا تھا کہ سلہٹ کے جنوبی حصہ میں جو شمالی بنگال سے ملحق تھا، تین ہندو اکثریت والے تھانے ہر طرف سے مسلم اکثریت کے خطوں میں گھرے ہوئے تھے۔ ان کے شمال میں بدرپور اور کریم گنج کے وسیع مسلم علاقے تھے جو ان تھانوں کو مغرب کی طرف سے بھی بھارتی رقبہ سے علیحدہ کر رہے تھے۔ جنوب میں شمالی بنگال کا مسلم علاقہ تھا اور مشرق میں کاچار کا ہیلا کندی سب ڈویژن پھیلا ہوا تھا، جو مسلم اکثریت پر مشتمل تھا۔ مَیں نے یہ دلیل پیش کی کہ سلہٹ کے بدرپور اور کریم گنج کے علاقے اور ہیلا کندی کا سب ڈویژن، اکثریت کے اصول کے تحت بدیہاً ہمارے حصے میں آ رہے تھے اور ان کے محلِ وقوع کے پیشِ نظر سلہٹ کے جنوبی تین ہندو تھانے جغرافیائی حیثیت کے تحت پاکستان سے ملحق رہنے چاہئیں۔ سر سیرل فوراً بول اٹھے "ہاں! اس نتیجہ سے مفر کی کوئی صورت مجھے نظر نہیں آتی"۔ اس قطعی رائے کے اظہار کے بعد میں مطمئن ہو گیا۔ لیکن جب بعد میں فیصلہ شائع ہوا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ حضرت نے مذکورہ بالا تین تھانے اور ان کے ارد گرد کا تھوڑا سا علاقہ ہمارے پلّے میں بے شک ڈالا تھا مگر ساتھ ہی بدرپور اور کریم گنج کا بیشتر حصہ اور ہیلا کندی کا سارا سب ڈویژن بھارت کی نذر کر دیا۔ ہماری آخری گفتگو اور فیصلے کے درمیانی وقفہ میں جو پوشیدہ عوامل ان کے ذہن پر اثر انداز ہوئے؛ وہ مختلف قیاس آرائیوں کا موضوع بنے رہے۔ یہ امر کہ مصدقہ اطلاعات کے مطابق پنجاب کی حد بندی کے سلسلہ میں بھی حضرت نے آخری لمحہ میں پاکستانی رقبہ میں تخفیف کر دی تھی، اس شبہ کو تقویت دیتا ہے کہ یہ رویہ کسی اونچی سطح پر سازش کا نتیجہ تھا۔ تاہم ان تمام کمیوں اور خامیوں کے باوجود قائداعظم (جو زندگی بھر اپنے قول کا مکمل پاس کرتے رہے) اپنے پہلے سے اعلان کردہ موقف سے سرِ مُو نہ ہٹے کہ کمیشن کا فیصلہ جو بھی ہو وہ انھیں قابلِ قبول ہو گا۔